اسلام میں شوریٰ اور قانون سازی کی صحیح نوعیت

(از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی)

[پنجاب کے حالیہ ہنگاموں کی تحقیقات کرنے والی عدالت نے جماعت اسلامی کو حکم دیا تھا کہ قانون سازی، شوریٰ اور اجماع سے متعلق اسلام کے احکام کی نہایت مختصر تشریح عدالت کے سامنے پیش کی جائے۔ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے اس غرض کے لیے ان مسائل پر چند اشارات سپردِ قلم کیے تھے جواب ترجمان میں شائع کیے جا رہے ہیں۔] (ادارہ)

اسلام میں قانون کا مأخذ چونکہ کتاب و سنّت کو قرار دیا گیا ہے اس وجہ سے بعض لوگوں کو یہ گمان ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں جمہور مسلمین کو قانون سازی کے کام میں سرے سے کوئی دخل ہے ہی نہیں۔ اوّل تو ان لوگوں کے خیال میں قرآن و حدیث کے ہوتے ہوئے قانون سازی کی اُس کے عام مفہوم کے لحاظ سے اسلام میں کوئی ضرورت ہے ہی نہیں اور اگر کچھ ضرورت ہے بھی تو وہ علماء کے فتووں یا امراء و خلفاء کے آمرانہ احکام سے پوری کر لی جاتی ہے، اس مقصد کے لیے ان کے نزدیک اسلام میں اس قسم کا کوئی نظام نہیں پایا جاتا ہے جس قسم کا نظام مغربی طرز کی جمہوریتوں میں مجالسِ قانون ساز کے نام سے پایا جاتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام میں قانون کے مآخذ کتاب اور سنّت ہی ہیں، جن چیزوں کے بارہ میں کتاب و سنّت کے اندر صریح احکام موجود ہیں ان کے بارہ میں مسلمانوں کے اربابِ حلّ و عقد اور ان کے اولوالامر کا منصب صرف ان قوانین کے اجرا و نفاذ تک محدود ہے، وہ ان قوانین و احکام کے اندر نہ کسی ترمیم و تنسیخ کے مجاز ہیں اور نہ ان کی جگہ دوسرے قوانین بنانے کا حق رکھتے ہیں لیکن جن معاملات میں کتاب و سنّت میں سکوت اختیار کیا گیا ہے ان میں امت کو قانون سازی کا پورا پورا حق دیا گیا ہے یہ حق کوئی محدود حق نہیں ہے بلکہ یہ نہایت وسیع دائرے کے اندر استعمال ہوتا ہے کیونکہ قرآن و حدیث

کے اندر بلشبہ صرف بنیادی اور اصولی باتیں ہی بیان کی گئی ہیں، جزئیات و تفصیلات سے ان میں بہت کم تعرض کیا گیا ہے۔ اس خلا کو حالات و ضروریات کے تقاضوں کے تحت بھرنا، نیز تمام پیش آنے والے اجتماعی و سیاسی معاملات میں اسلام کے منشا و مزاج کے مطابق قوانین بنانا امت کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے اور اس کے لیے ایک مکمل شورائی نظام خود کتاب و سنت کے اندر تجویز کر دیا گیا ہے جو مغربی جمہوریتوں کے نظام قانون سازی سے بدرجہا بہتر ہے۔

یہاں ہمارے لیے اس نظام کی تمام تفصیلات سے بحث کرنے کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن دورِ رسالت دورِ صحابہ اور دورِ فقہا میں جس شکل میں یہ نظام قائم رہا ہے ہم اجمالی طور پر اس کا خاکہ یہاں پیش کرتے ہیں اور اس کی تائید میں کتاب و سنت کے جو نصوص ابتدا سے اب تک مسلمان اہلِ فکر کی رہنمائی کرتے رہے ہیں ضمناً ہم ان میں سے چند ایک کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔

دورِ رسالت میں شورائی نظامِ قانون سازی کی تاسیس | نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ براہِ راست وحی الٰہی کی رہنمائی حاصل تھی اور آپ کسی معاملہ میں دوسروں سے مشورہ لینے کے محتاج نہ تھے لیکن اسلام میں شورائی نظام قانون سازی کے استحکام کے لیے چونکہ ضروری تھا کہ آپ خود اپنے طرزِ عمل سے اس کی بنیاد رکھیں اس وجہ سے آپ کو قرآن میں یہ حکم دیا گیا:-

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳۸- شوریٰ)

پس ان سے درگزر کرو اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت چاہو اور ان سے معاملات میں مشورہ لیتے رہو۔

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے معاملات میں مشورہ لیتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ حکم محض صحابہ کی دلداری اور حوصلہ افزائی ہی کے لیے تھا یا اس کی کوئی قانونی اہمیت بھی تھی اور ایسا کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ضروری تھا؟ اس سوال کا جواب فقۂ حنفی کے مشہور ماہر حجۃ الاسلام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۷۰ھ) نے اپنی مشہور کتاب "احکام القرآن" میں مندرجۂ ذیل الفاظ میں دیا ہے:-

وغیر جائز ان یکون الامر بالمشاورۃ

اور یہ بات ناجائز ہے کہ صحابہ سے مشورہ کرنے کا یہ

علی جهة تطييب نفوسهم ورفع اقدارهم و لتقتدی الامة به فی مثله لانه لو کان معلوما عندهم انهم اذا استفرغوا مجهودهم فی استنباط ما شوروا فيه وصواب الرأی فيما سئلوا عنه ثم لم يكن ذالك معمولا عليه ولا متلقى منه بالقبول بوجه لم يكن فی ذلك تطييب نفوسهم ولا رفع اقدارهم بل فيه ايحاشهم واعلامهم بان آراءهم غير مقبولة ولا معمول عليها۔ (احکام القرآن، ابوبکر حصاص ج ۲، ص۴۹)	حکم محض صحابہ کی دلداری اور ان کی عزت افزائی کے خیال سے دیا گیا ہو یا محض اس خیال سے دیا گیا ہو کہ اس طرح کے معاملات میں امت کو آپ کے اس طریقے کی اقتدا کرنے کی تعلیم دی جائے حالانکہ صحابہ کو اگر یہ علم ہوتا جب وہ زیر مشورہ امور میں اپنا سر کھپا کر کوئی رائے قائم کریں گے تو نہ تو اس پر عمل ہی ہوگا اور نہ ہی کسی پہلو سے اس کی قدر ہی کی جائے گی تو دلداری اور عزت افزائی کرنے کی بجائے اُلٹا اس کا اثر ان پر یہ پڑتا کہ وہ اس سے متوحش ہوتے اور سمجھتے کہ ان کی رائیں نہ قبول کیے جانے کے لیے ہیں نہ عمل کیے جانے کے لیے، بلکہ محض پیش کیے جانے کے لیے ہیں۔

حجۃ الاسلام کی اس تصریح سے واضح ہے کہ ان کے نزدیک صحابہؓ سے مشورہ لیتے رہنے کا یہ حکم محض رسمی اور ظاہر دارانہ نہیں تھا، بلکہ اس لیے تھا کہ مشورہ لینے کے بعد ان مشوروں پر عمل بھی کیا جائے۔ حجۃ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اس مشورے کے حدود بھی نہایت واضح الفاظ میں متعین کر دیے ہیں۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ مشورے صحابہ سے ان تمام امور میں حاصل کرتے تھے جن کے بارے میں کوئی نص موجود نہ ہو، عام اس سے کہ یہ معاملات دینی نوعیت کے ہوں یا دنیوی نوعیت کے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں :۔

وقال آخرون كان مامورا بمشاورتهم فی امور الدين والحوادث التی لا توقيف فيها عن الله تعالى وفی امور الدنيا ايضا مما طريقه الرای وغالب الظن وقد شاورهم يوم بدر	اور ایک دوسرے گروہ کا مذہب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ سے مشورہ لینے کا یہ حکم دینی معاملات اور اس طرح کے حوادث میں بھی تھا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی متعین ہدایت وارد نہ ہو چکی

فی الاساریٰ وکان ذالک من امور الدین۔ (احکام القرآن، ج ۲، ص۴۹)

ہو اور ان دنیوی معاملات میں بھی تھا جن میں فیصلے رائے و مشورہ اور گمان غالب کے تحت ہوا کرتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے موقع پر قیدیوں کے بارے میں صحابہ سے مشورہ لیا حالانکہ یہ معاملہ دینی معاملات کی قسم میں سے تھا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیتے رہنے کی مذکورۂ بالا قرآنی ہدایت پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اہتمام کے ساتھ عمل فرمایا اس کے متعلق ایک ایسے صحابی کی شہادت ملاحظہ ہو جو اپنے وقت کا بیشتر حصہ آپؐ کی صحبت میں بسر فرماتے تھے۔

عن ابی هریرة قال ما رأیت احداً قط کان اکثر مشورة لاصحابه من رسول الله صلی الله علیه وسلم (رواہ احمد والشافعی)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ لیتے رہنے والا کبھی کسی شخص کو نہیں پایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قسم کے معاملات میں صحابہ سے مشورے لیے ہیں ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان میں جنگی، سیاسی، اقتصادی اور سماجی ہر قسم کے معاملات داخل ہیں۔ ہم ان میں سے چند معاملات بطورِ مثال پیش کرتے ہیں۔

(۱) بدر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اوّل اوّل جس مقام پر پڑاؤ ڈالا، جنگی مصلحت کے لحاظ سے وہ کچھ مناسب نہ تھا۔ بعض صحابہ نے اس پر سوال اٹھایا کہ آپ نے یہ وحی الہٰی کے اشارے سے کیا ہے یا محض ذاتی صوابدید سے۔ جب آپ نے واضح فرمایا کہ آپ نے محض جنگی مصلحت سے ایسا کیا ہے تو ایک صحابی نے اس سے اختلاف کیا اور چشمے پر پڑاؤ ڈالنے کا مشورہ دیا۔ بالآخر صحابہ سے مشورہ کے بعد یہی رائے قرار پائی اور اسی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا (الطبقات الکبریٰ لابن سعد ج ۳، ص ۵۴)

(۲) غزوۂ احزاب کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غطفان کے سامنے یہ پیش کش کرنا چاہی کہ اگر وہ جنگ سے باز آجائیں تو آپؐ ان کو مدینے کے پھلوں کا ثلث حصہ سالانہ دیتے رہیں گے۔

اس کے لیے ایک معاہدے کا مسودہ بھی قلم بند ہو چکا تھا لیکن جب آپ نے اس معاملے میں صحابہ، خصوصاً انصار کے لیڈروں سے مشورہ کیا تو انہوں نے اس سے شدت کے ساتھ اختلاف کیا اور کہا کہ ہم تو ان سے صرف تلوار سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ بالآخر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی رائے قبول فرمائی اور معاہدے کا مسودہ چاک کرا دیا۔ (الطبقات الکبریٰ، ابن سعد، ج ۳، ص۱۱)

(۳) غزوۂ بدر کے قیدیوں کے معاملہ کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور طبقات الکبریٰ ابن سعد (ج ۳، ص۱۶) میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔

یہ چند واقعات بطور مثال ذکر کیے گئے ہیں۔ ان واقعات سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ تمام اہم معاملات میں صحابہ سے مشورہ لیتے رہتے تھے بلکہ ان پر عمل بھی فرماتے تھے۔

شوریٰ صحابہ اور خلفائے راشدین کے دور میں | نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب صحابہ کا دور آیا تو ان کے سامنے ایک طرف تو آپ کا مذکورۂ بالا اسوۂ حسنہ تھا اور دوسری طرف خود ان سے متعلق قرآن و حدیث دونوں میں نہایت واضح ہدایات اس بات کے لیے موجود تھیں کہ وہ کس اساس پر اپنا سیاسی نظام قائم کریں اور اس میں قانون سازی کا طریقہ کیا ہو۔ ہم پہلے وہ قرآنی ہدایت نقل کرتے ہیں جس پر صحابہ کا قائم کردہ نظام سیاسی مبنی تھا، اس کے بعد احادیث اور خلفائے راشدین کے طرز عمل سے اس کی وضاحت کریں گے۔

اس سلسلے میں قرآن مجید میں اصولی ہدایت یہ دی گئی ہے :-

وامرهم شوریٰ بینهم (سورۂ شوریٰ-۳۸) اور ان کا نظام باہمی مشورے پر مبنی ہے۔

اس اصولی ہدایت کی وضاحت بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی تھی۔

حدثنی ابوسلمة ان النبی صلی اللہ	مجھ سے ابو سلمہ نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے
علیه وسلم سئل عن الامر یحدث لیس	پوچھا گیا کہ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آن پڑے جس کا ذکر
فی کتاب ولا سنة فقال ینظر فیه العابدون	نہ تو کہیں قرآن میں ہو اور نہ سنت میں تو ایسی صورت

من المومنین - (سنن دارمی، باب التورع عن الجواب فیما لیس فی کتاب و لا سنۃ، ص ۲۸)

میں کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا کہ اس معاملہ پر مسلمانوں کے صالح لوگ غور کر کے اس کا فیصلہ کریں گے۔

اسی مضمون کی مزید وضاحت ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے:-

عن علی قال قلت یا رسول اللہ ان عرض لی امر لم ینزل قضاء فی امرہ ولا سنۃ کیف تأمرنی؟ قال تجعلونہ شوریٰ بین اھل الفقہ والعابدین من المؤمنین و لاتقض فیہ برأیك خاصۃ (رواہ الطبرانی فی الاوسط)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اگر میرے سامنے کوئی ایسا مسئلہ پیش آ جائے جس کا ذکر نہ قرآن میں ہو نہ سنت میں تو اس معاملہ میں آپ مجھے کیا روش اختیار کرنے کا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا اس کو قانون اسلامی میں بصیرت رکھنے والوں اور صالحین کے مشورے سے طے کرو اور اس میں تنہا اپنی رائے سے کوئی فیصلہ نہ کرو۔

چنانچہ اسی اصول پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہؓ نے نظام خلافت کی بنیاد رکھی جس میں خلیفہ کے انتخاب میں بھی جمہور مسلمین کے مشورہ کی شرط لازمی ٹھہری اور خلافت کے فرائض کی انجام دہی میں بھی شوریٰ کو ضروری قرار دیا گیا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ جو اسلام میں پہلے خلیفہ ہیں، مسلمانوں کے مشورۂ عام سے خلیفہ بنے اور خلیفہ بننے کے بعد انہوں نے تمام معاملات کا فیصلہ جن کے بارہ میں ان کو کتاب و سنت میں کوئی واضح ہدایت نہیں ملی ان لوگوں کے مشورے سے کیا جو جمہور مسلمین کے معتمد لیڈر تھے اور علم و دیانت کے لحاظ سے لوگوں میں بہتر خیال کیے جاتے تھے۔ ان کے طرزِ عمل سے متعلق سنن دارمی کی یہ حدیث ملاحظہ ہو:-

حدثنا میمون بن مھران فقال کان ابوبکر اذا ورد علیہ الخصم نظر فی کتاب اللہ فاذا وجد فیہ ما یقضی بینھم قضٰی بہ وان لم یکن فی الکتاب وعلم من

ہم سے میمون بن مہران نے حدیث بیان کی کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس فریقِ معاملہ کوئی مقدمہ لاتے تو وہ پہلے اس پر کتاب اللہ کی روشنی میں غور کرتے۔ اگر اس میں ان کو کوئی ایسی چیز مل جاتی جس سے ان کے معاملے کا فیصلہ ہو سکتا تو اس کے مطابق وہ اس کا فیصلہ کر دیتے اور

رسول الله صلی الله علیه وسلم فی ذالك الامر سنة قضیٰ به فان اعیاه خرج فسأل المسلمین وقال اتانی کذا وکذا فهل علمتم ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قضیٰ فی ذالك بقضاء فربما اجتمع الیه النفر کلهم یذکر من رسول الله صلی الله علیه وسلم فیه قضاء فیقول ابوبکر الحمد لله الذی جعل فینا من یحفظ علی نبینا فان اعیاه ان یجد فیه سنة من رسول الله صلی الله علیه وسلم جمع رؤس الناس وخیارهم فاستشارهم فاذا اجتمع رأیهم علی امر قضیٰ به -

اگر کتاب اللہ میں ان کو اس کے فیصلے کے لیے کوئی چیز نہ ملتی اور سنت رسول اللہ میں کوئی چیز مل جاتی تو پھر اس کے مطابق فیصلہ کرتے۔ لیکن اگر سنت رسول اللہ میں بھی کوئی چیز نہ پاتے تو مسلمانوں سے دریافت کرتے کہ میرے سامنے اس اس طرح کا معاملہ آیا ہے۔ کیا کسی شخص کے علم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایسا فیصلہ ہے جو اس قسم کے معاملے سے متعلق ہو؟ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ آپ کے پاس متعدد ایسے اشخاص جمع ہو جاتے جو اس قسم کے معاملے سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ بیان کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت ابوبکر اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے کہ امت کے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جو رسول کا علم محفوظ کیے ہوئے ہیں لیکن اگر اس تلاش کے بعد بھی ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت نہ ملتی تو پھر قوم کے لیڈروں اور ان کے اچھے لوگوں کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے اور جب وہ کسی بات پر جم جاتے تو اس کے مطابق وہ معاملے کا فیصلہ کر دیتے -

حضرت عمرؓ کے دور میں تمام سیاسی واختلافی امور میں شوریٰ کا جو اہتمام رہا اس کا تذکرہ شاہ ولی اللہؒ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے :-

کان من سیرة عمر رضی الله عنه انه کان یشاور الصحابة ویناظرهم حتی تنکشف الغمة ویاتیه الثلج فصار غالب قضایاه و

حضرت عمرؓ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ معاملات میں صحابہ سے مشورہ کرتے اور ان سے بحث کرتے یہاں تک کہ الجھن دور ہو جاتی اور دل پوری طرح مطمئن ہو جاتا۔ یہ اسی کا اثر ہے

فتاواہ متبعۃ فی مشارق الارض ومغاربھا۔
(حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۳۲)

کہ ان کے فتوے اور فیصلے تمام مشرق ومغرب میں معمول بہ بنے۔

صرف حضرت عمرؓ کے زمانے ہی کے متعلق نہیں بلکہ حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے تک کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہی ہے کہ انتظامِ ملکی اور قانون سازی سے متعلق سارے معاملات شوریٰ کے ذریعے سے ہی انجام پاتے تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب اپنی مشہور تصنیف "ازالۃ الخفاء" میں فرماتے ہیں:۔

تحقیق آنست کہ تا زمانِ حضرت عثمانؓ اختلاف مسائل فقہیہ واقع نمے شد۔ در محل اختلاف بخلیفہ رجوع مے کردند وخلیفہ بعد مشاورت امرے اختیار مے کرد وہماں امر مجمع علیہ مے شد۔
(ازالۃ الخفاء، حضرت شاہ ولی اللہ، مقصد اول ص ۶)

اور اس معاملے میں تحقیق یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک فقہی اختلافات برپا ہونے نہیں پائے تھے جب کوئی اختلافی مسئلہ پیدا ہوتا تو لوگ خلیفہ کی طرف رجوع کرتے اور خلیفہ مشورہ کرنے کے بعد ایک رائے قائم کرتا اور پھر وہی اجماعی فیصلے کی حیثیت اختیار کر لیتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس شورائی نظام نے جس حد تک ترقی کی اس کی تفصیل مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور تصنیف "الفاروق" میں وضاحت کے ساتھ پیش کی ہے۔ چونکہ یہ ساری بحث نہایت مضبوط دلائل پر مبنی ہے اور سارا موادِ بحث انہوں نے طبقات ابن سعد، کنز العمال، تاریخ طبری اور قاضی ابو یوسف صاحب کی کتاب الخراج وغیرہ جیسی مشہور اور مستند کتابوں سے لیا ہے اس وجہ سے ہم اس کے بعض ضروری حصوں کا اقتباس یہاں پیش کرتے ہیں۔

فاضل مصنف حضرت عمرؓ کی خلافت میں مجلسِ شوریٰ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ان سب میں اصل الاصول مجلس شوریٰ کا انعقاد تھا یعنی جب کوئی انتظام پیش آتا تھا تو ہمیشہ اربابِ شوریٰ کی مجلس منعقد ہوتی تھی اور کوئی امر بغیر مشورے اور کثرتِ رائے کے عمل میں نہیں آسکتا تھا۔ تمام جماعتِ اسلام میں اس وقت دو گروہ تھے جو کل قوم کے پیشوا تھے اور جن کو تمام عرب نے گویا اپنا قائم مقام تسلیم کر لیا تھا، یعنی مہاجرین وانصار۔ مجلسِ شوریٰ میں ہمیشہ لازمی طور پر ان دونوں گروہوں کے ارکان شریک ہوتے تھے۔ انصار بھی دو قبیلوں میں منقسم تھے، اوس وخزرج۔

چنانچہ ان دونوں خاندانوں کا مجلس شوریٰ میں شریک ہونا ضروری تھا مجلس شوریٰ کے تمام ارکان کے نام اگرچہ ہم نہیں بتا سکتے تاہم اس قدر معلوم ہے کہ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، معاذ بن جبلؓ، ابی بنؓ کعب، زیدؓ بن ثابت اس میں شامل تھے۔ مجلس کے انعقاد کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے ایک منادی اعلان کرتا کہ الصلوٰۃ جامعۃ، یعنی سب لوگ نماز کے لیے جمع ہو جائیں۔ جب لوگ جمع ہو جاتے تھے تو حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں جا کر دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ نماز کے بعد منبر پر چڑھ کر خطبہ دیتے تھے اور بحث طلب امر پیش کیا جاتا۔"

"معمولی اور روزمرہ کے کاروبار میں اس مجلس کے فیصلے کافی سمجھے جاتے تھے لیکن جب کوئی امر اہم پیش آتا تھا تو مہاجرین اور انصار کا اجلاس عام ہوتا تھا اور سب کے اتفاق سے وہ امر طے پاتا تھا۔ مثلاً عراق و شام کے فتح ہونے پر جب بعض صحابہ نے اصرار کیا کہ تمام مفتوحہ مقامات فوج کی جاگیر میں دے دیئے جائیں تو بہت بڑی مجلس منعقد ہوئی جس میں تمام قدماء مہاجرین اور انصار میں سے عام لوگوں کے علاوہ دس بڑے بڑے سردار جو تمام قوم میں ممتاز تھے اور جن میں پانچ شخص قبیلہ اوس اور پانچ قبیلہ خزرج کے تھے، شریک ہوئے۔ کئی دن تک مجلس کے جلسے ہوتے رہے اور نہایت آزادی و بیباکی سے لوگوں نے تقریریں کیں۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے جو تقریر کی اس کے جستہ جستہ فقرے ہم اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں، کہ اس سے منصب خلافت کی حقیقت اور خلیفۂ وقت کے اختیارات کا اندازہ ہوتا ہے۔

انی لم ازعجکم الا لان تشترکوا فی امانتی فیما حملت من امورکم فانی واحد کاحدکم ولست ارید ان تتبعوا ہذا الذی ھوای۔	میں نے آپ حضرات کو صرف اس لیے زحمت دی ہے کہ آپ میری اس امانت میں شریک ہوں جس کا بار آپ کے معاملات کے بارے میں مجھ پر ڈالا گیا ہے میں تم ہی جیسا ایک شخص ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ آپ اس چیز کا اتباع کریں جو میری خواہش کے مطابق ہو۔ [1]

[1] یہ ترجمہ الفاروق میں نہیں ہے، بلکہ ہم نے کیا ہے۔

"سنہ ۲۱ھ میں جب نہاوند کا سخت معرکہ پیش آیا اور عجمیوں نے اس سروسامان سے تیاری کی کہ لوگوں کے نزدیک خود خلیفۂ وقت کا اس مہم پر جانا ضروری ٹھہرا تو بہت بڑی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی۔ حضرت عثمانؓ، طلحہؓ بن عبید اللہ، زبیرؓ بن العوام، عبد الرحمٰنؓ بن عوف وغیرہ نے باری باری کھڑے ہو کر تقریریں کیں اور کہا کہ آپ کا خود موقع جنگ پر جانا مناسب نہیں۔ پھر حضرت علیؓ کھڑے ہوئے اور ان لوگوں کی تائید میں تقریر کی۔ غرض کثرت رائے سے یہی فیصلہ ہوا کہ خود حضرت عمرؓ موقع جنگ پر نہ جائیں۔ اسی طرح فوج کی تنخواہ، دفتر کی ترتیب، عمّال کا تقرر، غیر قوموں کو تجارت کی آزادی اور ان پر محصول کی تشخیص، اس قسم کے بہت سے معاملات ہیں جن کی نسبت تاریخوں میں تصریح مذکور ہے کہ مجلس شوریٰ میں پیش ہو کر طے پائے۔"

"مجلس شوریٰ کا انعقاد اور اہل الرائے کی مشورت استحسان اور تبرع کے طور پر نہ تھی بلکہ حضرت عمرؓ نے مختلف موقعوں پر صاف صاف فرما دیا تھا کہ مشورے کے بغیر خلافت سرے سے جائز ہی نہیں۔ ان کے خاص الفاظ یہ ہیں "لاخلافۃ الاعن مشورۃ"۔ مجلس شوریٰ کا اجلاس اکثر خاص خاص ضرورتوں کے پیش آنے کے وقت ہوتا تھا لیکن اس کے علاوہ ایک اور مجلس تھی جہاں روزانہ انتظامات اور ضروریات پر گفتگو ہوتی تھی۔ یہ مجلس ہمیشہ مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھی اور صرف مہاجرین صحابہ اس میں شریک ہوتے تھے۔ صوبجات اور اضلاع کی روزانہ خبریں جو دربارِ خلافت میں پہنچتی تھیں حضرت عمرؓ ان کو اس مجلس میں بیان کیا کرتے تھے اور کوئی بحث طلب امر ہوتا تھا تو اس میں لوگوں سے استصواب کیا جاتا تھا۔ مجوسیوں پر جزیہ مقرر کرنے کا مسئلہ اوّل اسی مجلس میں پیش ہوا تھا۔ مؤرخ بلاذری نے اس مجلس کا حال ایک ضمنی تذکرے میں ان الفاظ میں لکھا ہے:۔

کان للمہاجرین مجلس فی المسجد	مہاجرین کی ایک مجلس مسجد نبوی میں اپنی نشست
فکان عمر یجلس معہم فیہ ویحدثہم	کیا کرتی تھی۔ حضرت عمرؓ اس کے سامنے وہ تمام
عما ینتہی الیہ من امر الآفاق فقال	حالات رکھا کرتے تھے جو مملکت کے مختلف

یومًا ما ادری کیف اصنع بالمجوس۔ گوشوں سے ان کو پہنچا کرتے تھے۔ اس مجلس میں ایک روز انہوں نے یہ سوال اٹھایا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجوس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔[1]

حضرت عمرؓ کے زمانے میں نہ صرف اہم امور ملکی شوریٰ سے انجام پاتے تھے بلکہ صوبجات اور اضلاع کے حکام بھی اکثر رعایا کی مرضی سے مقرر کیے جاتے تھے۔ چنانچہ یہی علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کتاب الخراج قاضی ابویوسفؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

"کوفہ، بصرہ اور شام میں جب عمّال مقرر کیے جانے لگے تو حضرت عمرؓ نے ان تینوں صوبوں میں احکام بھیجے کہ وہاں کے لوگ اپنی اپنی پسند سے ایک ایک شخص کا انتخاب کرکے بھیجیں جو ان لوگوں کے نزدیک تمام لوگوں سے زیادہ دیانتدار اور قابل ہو۔ چنانچہ کوفہ سے عثمان بن فرقد، بصرہ سے حجاج بن علاط، شام سے معن بن یزید کو لوگوں نے منتخب کرکے بھیجا اور حضرت عمرؓ نے انہی لوگوں کو ان مقامات کا حاکم مقرر کیا۔ قاضی ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے یہ ہیں:۔

"کتب عمر بن الخطاب الی اھل الکوفہ یبعثون الیہ رجلا من اخیرھم و اصلحھم والی اھل البصرۃ کذالک والی اھل الشام کذالک۔ قال فبعث الیہ اھل الکوفۃ عثمان بن فرقد، ولعبث الیہ اھل الشام معن بن یزید ولعبث الیہ اھل البصرۃ الحجاج بن علاط کلھم سمیون قال فاستعمل کل واحد منھم علیٰ خراج ارضہ[2]"

مجلس شوریٰ کی نوعیت اور اس کے ارکان کی صفات | مجلس شوریٰ کی نوعیت اور اس کے ارکان کی صفات سے متعلق بھی بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ شوریٰ صرف علماء اور فقہاء پر مشتمل ہوتی

[1] عربی عبارت کا ترجمہ ہماری طرف سے ہے۔ بقیہ ساری عبارت "الفاروق" صفحہ ۴۱۔ ۴۴ سے منقول ہے۔

[2] "الفاروق" مصنفہ علامہ شبلی نعمانی بحوالہ کتاب الخراج قاضی ابویوسفؒ۔

تھی، دوسرے لوگوں کو اس میں بار حاصل نہ تھا۔ بعض لوگ اس کو ایک بالکل مبہم اور غیر متعین چیز سمجھتے ہیں کہ خلیفہ جن اشخاص سے چاہے مشورہ کرے۔ کسی متعین شوریٰ سے مشورہ کرنے کا وہ پابند نہیں ہے۔ ان غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے چند ضروری باتوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اہلِ شوریٰ کی صفات سے متعلق مندرجۂ ذیل ہدایت دی گئی ہے:۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (۸۳ - سورۂ نساء)

اور جب ان کو امن یا خطرے کی کوئی اطلاع ملتی ہے تو اس کو پھیلا دیتے ہیں اور اگر وہ اس کو رسول اور اپنے اہلِ حل و عقد کے سامنے پیش کرتے تو اس کو وہ لوگ جو اہلِ بصیرت ہیں ٹھیک طور پر سمجھ سکتے۔

اس آیت میں اسلامی نظام میں جن لوگوں کے سامنے معاملات پیش کیے جانے چاہئیں ان کی دو صفتیں متعین طور پر بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ وہ مسلمانوں کے اولی الامر یعنی سربراہ کار ہوں، دوسرے یہ کہ وہ اہلِ استنباط یعنی معاملات کی سوجھ بوجھ اور دینی و سیاسی بصیرت رکھنے والے ہوں۔ ہمارے مفسرین نے مذکورۂ بالا الفاظ کی یہی تفسیر کی ہے۔

"کشاف" میں مذکورہ آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"ھم کبراء الصحابۃ البصراء بالامور (کشاف ج ۱، ۲۱۲) اس سے مراد اکابر صحابہ اور اہلِ بصیرت لوگ ہیں۔

اسی کے ہم معنی الفاظ امام نیشاپوری اور امام رازی کی تفسیر میں وارد ہیں۔

روایات سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ شوریٰ کے لیے وہ لوگ بلائے جاتے تھے جو عوام کے معتمد لیڈر اور دینی و دنیوی معاملات میں بصیرت رکھنے والے اور مسلمانوں کے سربراہ کار ہوتے تھے۔ ان کے بارے میں بوڑھے اور جوان کی بھی تخصیص نہ تھی۔ چنانچہ بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ اعراف میں حضرت ابن عباسؓ کا قول مروی ہے کہ کان القراء اصحاب مجالس عمر و مشاورتہ کھولاً کانوا اوشبانا (حضرت عمرؓ کی مجالسِ مشاورت میں ذی علم لوگ ہوا کرتے تھے خواہ وہ سن رسیدہ ہوں یا جوان

ہوں)۔ حضرت ابوبکرؓ کے متعلق اوپر گزر چکا ہے کہ وہ مشورہ کے لیے مسلمانوں کے لیڈروں اور ان کے اخیار کو بلاتے تھے جمع رؤس الناس وخیارھم۔ بعض روایات میں ایک جامع لفظ صالحینؓ کا بھی استعمال ہوا ہے۔

تاریخ اور سیرت میں متعین طور پر جن لوگوں کے نام ملتے ہیں وہ یہ ہیں:-

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت ابیؓ بن کعب، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت سعدؓ بن معاذ، حضرت سعدؓ بن عبادہ وغیرہ۔ ان ناموں پر غور کرکے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ لوگ یا تو مختلف اسلامی پارٹیوں کے معتمد علیہ لیڈر تھے یا دینی و مذہبی بصیرت کے اعتبار سے کوئی نمایاں مقام مسلمانوں میں رکھتے تھے۔ مثلاً حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما مہاجرین کے مسلم لیڈر تھے اور مذہبی بصیرت اور سیاسی سوجھ بوجھ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ حضرت سعدؓ بن معاذ اور سعدؓ بن عبادہ انصار کی دونوں پارٹیوں (اوس وخزرج) کے لیڈر تھے۔ حضرت عثمانؓ غنی بنو امیہ کے لیڈر تھے۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف بنو زہرہ کے لیڈر تھے۔ حضرت علیؓ بنی ہاشم کے لیڈر تھے، معاذؓ بن جبل، ابیؓ بن کعب اور زیدؓ بن ثابت قرآنی علوم اور فقہ کے ماہرین میں سے تھے۔

مجلس شوریٰ کی تشکیل اب دوسرا سوال ان اربابِ حل وعقد کے متعلق یہ ہے کہ وہ کیسے چُنے جائیں گے اور کون ان کو چُنے گا۔ سرسری مطالعے کی بنا پر لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ خلافتِ راشدہ میں چونکہ عام انتخابات (GENERAL ELECTION) کے ذریعہ سے ارکانِ شوریٰ منتخب نہیں ہوتے تھے اس لیے اسلام میں سرے سے مشورے کا کوئی قاعدہ ہی نہیں ہے، بلکہ یہ بات بالکل خلیفۂ وقت کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ جس سے چاہے مشورہ لے۔ لیکن یہ گمان درِاصل اُس زمانے کی باتوں کو اِس زمانے کے ماحول میں رکھ کر دیکھنے سے پیدا ہوا ہے، حالانکہ اُن کو اُسی وقت کے ماحول میں رکھ کر دیکھنا چاہیے اور عملی تفصیلات کے اندر وہ اصول سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے جو ان میں ملحوظ رکھے گئے تھے۔

اسلام مکہ معظمہ میں ایک تحریک کی حیثیت سے اٹھا تھا۔ تحریکوں کے مزاج کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ جو لوگ سب سے پہلے آگے بڑھ کر اُن کو لبیک کہتے ہیں وہی لیڈر کے رفیق، دست و بازو اور مشیر ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اسلام میں بھی جو سابقین اولین تھے وہ بالکل ایک فطری طریقے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق اور مشیر قرار پائے جن سے آپ ہر ایسے معاملے میں مشورہ کرتے تھے جس میں خدا کی طرف سے کوئی صریح حکم آیا ہوا نہ ہوتا تھا۔ پھر جب اس تحریک میں نئے نئے آدمیوں کا اضافہ ہونے لگا اور مخالف طاقتوں سے اس کی کشمکش بڑھتی گئی تو ایسے لوگ خود بخود نمایاں ہوتے چلے گئے جو اپنی خدمات، قربانیوں، اور بصیرت و فراست کی بنا پر جماعت میں ممتاز تھے۔ ان کا انتخاب ووٹوں سے نہیں بلکہ تجربات اور آزمائشوں سے ہوا تھا جو الیکشن کی بہ نسبت زیادہ صحیح اور فطری طریق انتخاب ہے۔ اس طرح مکہ چھوڑنے سے پہلے ہی دو قسم کے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس شوریٰ کے رکن بن چکے تھے۔ ایک سابقین اولین۔ دوسرے وہ آزمودہ کار اصحاب جو بعد میں جماعت کے اندر نمایاں ہوئے۔ یہ دونوں گروہ ایسے تھے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح تمام مسلمانوں کا اعتماد بھی حاصل تھا۔

اس کے بعد ہجرت کا اہم واقعہ پیش آیا، اور اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ ڈیڑھ دو سال پہلے مدینے کے چند بااثر لوگ اسلام قبول کر چکے تھے اور ان کے اثر سے اوس اور خزرج کے قبیلوں میں گھر گھر اسلام پہنچ گیا تھا۔ انہی لوگوں کی دعوت پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مہاجرین اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینے منتقل ہوئے اور وہاں اسلام کی اس تحریک نے ایک سیاسی نظام اور ایک ریاست کی شکل اختیار کی۔ اب یہ بالکل ایک قدرتی بات تھی کہ مدینے میں جن لوگوں کے اثر سے اسلام پھیلا اور پھیلتا گیا وہی اس جدید معاشرے اور سیاسی نظام میں مقامی لیڈروں کی پوزیشن پر فائز ہوئے، اور انہی کا یہ مرتبہ و مقام تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس شوریٰ میں سابقین اولین، اور آزمودہ کار مہاجرین کے ساتھ ایک تیسرے عنصر (انصار) کی حیثیت سے شامل ہوں۔ یہ لوگ بھی فطری طریق انتخاب سے منتخب ہوئے تھے اور مسلمان قبیلوں کے ایسے معتمد علیہ تھے کہ اگر موجودہ زمانے کے طریقے پر انتخابات منعقد ہوتے تب بھی یہی لوگ منتخب ہو کر آتے۔

پھر مدنی معاشرے میں دو قسم کے لوگ اور اُبھرتے شروع ہوئے۔ ایک وہ جنہوں نے آٹھ دس برس کی سیاسی، فوجی اور تبلیغی مہمات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے حتیٰ کہ ہر اہم معاملے میں انہی کی طرف لوگوں کی نگاہیں اٹھنے لگیں۔ دوسرے وہ لوگ جنہوں نے قرآن کے علم و فہم اور دین میں تفقہ کے اعتبار سے ناموری حاصل کی حتیٰ کہ عوام الناس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علم دین میں انہی کو سب سے زیادہ معتبر سمجھنے لگے اور خود آنحضورؐ نے بھی یہ فرما کر ان کو سندِ اعتبار عطا کی کہ قرآن فلاں شخص سے سیکھو، اور فلاں نوعیت کے مسائل میں فلاں شخص کی طرف رجوع کرو۔ یہ دونوں عناصر بھی مجلسِ شوریٰ میں بالکل ایک فطری انتخاب سے شامل ہوتے چلے گئے اور ان میں بھی کسی کے لیے ووٹ لینے کی حاجت پیش نہ آئی۔ ووٹ اگر لیے بھی جاتے تو اس معاشرے میں ان کے سوا کوئی ایسا نہ تھا جس پر مسلمانوں کی نگاہِ انتخاب پڑتی۔

اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں وہ مجلسِ شوریٰ بن چکی تھی جو بعد کو خلفائے راشدین کی مشیر قرار پائی، اور وہ دستوری روایات بھی مستحکم ہو چکی تھیں جن کے مطابق آگے چل کر ایسے نئے لوگ اس مجلس میں شامل ہوتے گئے جنہوں نے اپنی خدمات اور اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیتوں کے ذریعہ سے قبولِ عام حاصل کر کے اس مجلس میں اپنی جگہ پیدا کی یہی وہ لوگ تھے جن کو اہل الحل والعقد (باندھنے اور کھولنے والے) کہا جاتا تھا اور جن کے مشورے کے بغیر خلفائے راشدین کسی اہم معاملے کا فیصلہ نہ کرتے تھے۔ ان کی آئینی حیثیت کا صحیح اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد چند اصحاب نے حضرت علیؓ کے پاس حاضر ہو کر خلافت قبول کرنے کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا:۔

لیس ذالک الیکم، انما هو لاهل الشوریٰ واهل بدر فمن رضی به اهل الشوریٰ واهل بدر فهو الخلیفة فنجتمع و ننظر فی هٰذا الامر ۔ (الامامة والسیاسة لابن قتیبة مطبعة الفتوح، مصر صفحہ ۴۱)	یہ معاملہ تمہارے فیصلہ کرنے کا نہیں ہے۔ یہ تو اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر کا کام ہے۔ جس کو اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر پسند کریں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملے پر غور کریں گے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہل الحل والعقد اس وقت کچھ متعین لوگ تھے جو پہلے سے

اس پوزیشن پر فائز چلے آ رہے تھے اور وہی ملت کے اہم معاملات کا فیصلہ کرنے کے مجاز تھے۔ لہٰذا یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ خلیفۂ وقت من مانے طریقے پر جس وقت جس کو چاہتا تھا مشورے کے لیے بلا لیتا تھا اور کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ مستقل اہلِ شوریٰ یا اہلِ حل و عقد کون ہیں جو قوم کے مسائل مہمہ کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔

خلافتِ راشدہ کے اس تعامل، بلکہ خود اسوۂ نبوی سے جو قاعدۂ کلیہ مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ امیر کو مشورہ ہر کس و ناکس سے، یا اپنی مرضی کے چنے ہوئے لوگوں سے نہیں بلکہ اُن لوگوں سے کرنا چاہیے جو عامۂ مسلمین کے معتمد ہوں، جن کے اخلاص و خیر خواہی اور اہلیت پر لوگ مطمئن ہوں، اور حکومت کے فیصلوں میں جن کی شرکت اس امر کی ضامن ہو کہ ان فیصلوں کے نفاذ میں جمہورِ قوم کا دلی تعاون شریک ہو گا۔ رہا یہ سوال کہ عوام کے معتمد لوگ کیسے معلوم کیے جائیں، تو ظاہر ہے کہ اس چیز کے معلوم ہونے کی جو صورت آغازِ اسلام کے مخصوص حالات میں تھی آج وہ صورت نہیں ہے، اور اُس زمانے کے تمدنی حالات میں جو موانع موجود تھے وہ بھی آج موجود نہیں ہیں۔ اس لیے ہم آج کے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے وہ تمام ممکن اور مباح طریقے اختیار کر سکتے ہیں جن سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ جمہورِ قوم کا اعتماد کن لوگوں کو حاصل ہے۔ آج کل کے انتخابات بھی اس کے جائز طریقوں میں سے ایک ہیں، بشرطیکہ اُن میں وہ ذلیل ہتھکنڈے استعمال نہ ہوں جنہوں نے جمہوریت کو ایک مذاق بنا کر رکھ دیا ہے۔[1]

اجماع حضرات خلفاء راشدین کے زمانے میں وقت کے جو اربابِ حل و عقد اس طرح کسی امرِ دینی پر متفق ہو جاتے تھے تو اس کو اجماع کہتے تھے اور یہ اجماع ایک مستقل شرعی حجت کی حیثیت حاصل کر گیا تھا۔ یہی اجماع درحقیقت اجماع کی سب سے اعلیٰ قسم ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے مندرجۂ ذیل روایات کافی ہونگی:۔

عن المسیب بن رافع قال کانوا اذا نزلت بھم قضیۃ لیس فیھا من رسول اللہ

مسیب بن رافع سے روایت ہے کہ جب صحابہ کے سامنے کوئی ایسا مسئلہ آتا جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ

[1] مجلسِ شوریٰ کی تشکیل سے متعلق یہ ساری عبارت "اسلامی دستور کی تدوین" از مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی سے نقل کی گئی ہے

صلی اللہ علیہ وسلم اذا اجتمعوا اجمعوا فالحق فیما رأو (سنن دارمی، ص ۲۵)

صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہ ہوتی تو اس کے لیے وہ مجتمع ہوتے اور ایک بات پر اتفاق کرتے تو جس بات پر وہ متفق ہو جاتے حق اُسی کے اندر ہوتا۔

اس اجماع کے حجت ہونے پر مسلمان بالکل متفق ہیں۔ اس کے بارے میں حضرت عمرؓ نے قاضی شُریح کو لکھا تھا:۔

فان جاءك ما ليس فى كتاب الله ولم يكن فيه سنة من رسول الله صلى الله عليه وسلم فانظروا ما اجتمع عليه الناس فخذبه (سنن دارمی، ص ۳۳)

اور اگر تمہارے سامنے کوئی ایسا معاملہ آجائے جس کا ذکر نہ تو کتاب اللہ میں ہو اور نہ اس کے بارے میں سنت رسول اللہ میں کچھ ہو تو مسلمانوں نے جس بات پر اجماع کیا ہو اُس کو دیکھو اور اس کو اختیار کرو۔

اجماع کی تعریف میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اجماع اس چیز کا نام ہے کہ "ایک مسئلے میں تمام اہل علم متفق ہوں اور کوئی ایک قول بھی اس کے خلاف نہ پایا جاتا ہو" ابن جریر طبری اور ابو بکر رازی کی اصطلاح میں اکثریت کا قول بھی "اجماع" ہے۔ امام احمدؒ جب کسی مسئلے میں یہ کہتے ہیں کہ "ہمارے علم میں اس کے خلاف کوئی قول نہیں ہے" تو اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ امام موصوف کے نزدیک اس مسئلے میں اجماع ہے۔

یہ امر سب کے نزدیک مسلم ہے کہ "اجماع" حجت ہے یعنی نص کی جس تعبیر پر، یا جس قیاس واجتہاد پر، یا جس قانونِ مصلحت پر اجماع امت ہو گیا ہو اس کی پیروی لازم ہے۔ لیکن اختلاف جس امر میں ہے وہ اجماع کا وقوع وثبوت ہے نہ کہ بجائے خود اجماع کا حجت ہونا۔ جہاں تک خلافتِ راشدہ کے دور کا تعلق ہے، چونکہ اُس زمانے میں اسلامی نظامِ جماعت باقاعدہ قائم تھا اور شوریٰ پر نظام چل رہا تھا، اس لیے اُس وقت کے اجماعی اور جمہوری فیصلے تو معلوم اور معتبر روایات سے ثابت ہیں لیکن بعد کے دور میں جب نظامِ جماعت درہم برہم اور شوریٰ کا طریقہ ختم ہو گیا تو یہ معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا کہ کس چیز پر فی الحقیقت اجماع ہے اور کس چیز پر نہیں ہے۔ اسی بنا پر خلافتِ

راشدہ کے دَور کا اجماع تو نا قابلِ انکار مانا جاتا ہے، مگر بعد کے دَور میں جب کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ فلاں مسئلے پر اجماع ہے تو محققین اس کے اس دعوے کو رد کر دیتے ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کس بات پر اجماع ہے اور کس بات پر نہیں ہے اسلامی نظام کا قیام ضروری ہے۔

عام طور پر جو یہ مشہور ہے کہ امام شافعیؒ یا امام احمد ابن حنبلؒ سرے سے اجماع کے وجود ہی کے منکر تھے، یا کسی دوسرے امام نے اس کا انکار کیا ہے، یہ سب کچھ اُس بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ جب کسی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اُس پر اجماع ہے، درآنحالیکہ اس کا کوئی ثبوت موجود نہ ہوتا، تو یہ لوگ اس کے اس دعوے کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔ امام شافعی نے اپنی "کتاب جماع العلم" میں اس مسئلے پر مفصل بحث کر کے یہ بتایا ہے کہ دنیائے اسلام کے پھیل جانے اور جگہ جگہ اہلِ علم کے منتشر ہو جانے اور نظامِ جماعت درہم برہم ہو جانے کے بعد اب کسی جزوی مسئلے کے متعلق یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ اس میں تمام علماء کے اقوال کیا ہیں۔ اس لیے جزئیات میں اب اجماع کا دعویٰ کرنا غلط ہے۔ البتہ اسلام کے اصولوں اور اس کے ارکان اور بڑے بڑے مسائل کے بارے میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان پر اجماع ہے، مثلاً یہ کہ نماز کے اوقات پانچ ہیں، یا روزے کے حدود یہ ہیں وغیرہ۔

اسی بات کو امام ابن تیمیہؒ یوں بیان کرتے ہیں:۔

> "اجماع کے معنی یہ ہیں کہ کسی حکم پر تمام علماءِ مسلمین متفق ہو جائیں۔ اور جب کسی حکم پر تمام امت کا اجماع ثابت ہو جائے تو کسی شخص کو اس سے نکلنے کا حق نہیں رہتا، کیونکہ پوری امت کبھی ضلالت پر متفق نہیں ہو سکتی۔ لیکن بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کے متعلق بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ ان میں اجماع ہے حالانکہ دراصل وہ نہیں ہوتا، بلکہ بسا اوقات دوسرا قول راجح ہوتا ہے۔" (فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۱ صفحہ ۴۰۶)

مذکورۂ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کسی مسئلے میں نصِ شرع کی کسی تعبیر پر، یا کسی قیاس یا استنباط پر، یا کسی تدبیر و مصلحت پر اب بھی اہلِ حل و عقد کا اجماع، یا ان کی اکثریت

کا فیصلہ فی الواقع ہو جائے تو وہ حجت ہو گا اور قانون قرار پائے گا۔ اس طرح کا فیصلہ اگر تمام دنیائے اسلام کے اہلِ حلّ وعقد کریں تو وہ تمام دنیائے اسلام کے لیے قانون ہو گا، اور اگر کسی ایک اسلامی مملکت کے اہلِ حلّ وعقد کریں تو وہ کم از کم اس مملکت کے لیے تو قانون ہونا چاہیے۔

مصالح مرسلہ علاوہ ازیں فقہاء نے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ جن معاملات کے بارے میں کتاب وسنّت اور اجماع میں کوئی نص موجود نہ ہو اور نہ شریعت کے اشارات ہی میں کوئی چیز ایسی مل رہی ہو جو اس کے موافق یا مخالف فیصلہ کرنے میں مدد دے سکے تو مسلمان اپنے جماعتی اور اسلامی مصالح کے تحت اس کے متعلق قانون بنانے، اور فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ مالکیہ اس اصول کو مصالح مرسلہ سے تعبیر کرتے ہیں اور اس چیز کو بھی انھوں نے منجملہ ادلۂ شرعیہ کے شمار کیا ہے۔

امام شاطبی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی مشہور تصنیف "الاعتصام" جلد ۲ میں ایسی بہت سی مثالیں نقل کی ہیں جو مصالح مرسلہ کے تحت آتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ کسی وقت اسلامی ریاست اپنی فوجی یا دوسری ضروریات کے لیے روپے کی کمی محسوس کرے اور مالداروں پر کوئی خاص ٹیکس عائد کرنے کی ضرورت محسوس کرے تو ایسا کر سکتی ہے۔

قرافی نے یہ ثابت کیا ہے کہ مصالح مرسلہ کے اصول کے قائل صرف مالکیہ ہی نہیں ہیں بلکہ فقہ اسلامی کے تمام مذاہب نے اس سے کام لیا ہے اور انھوں نے صحابہ کے دور سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں، مثلاً:۔

(۱) قرآن کی جمع وترتیب (۲) خلیفہ کی نامزدگی حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے (۳) خلیفہ کا انتخاب ایک شورائی کونسل کے ذریعے سے (۴) دفاتر کا قیام (۵) سکّے کا اجرا (۶) جیل خانوں کا قیام[1]۔

مصالح مرسلہ کے اصول کے استعمال میں شرط صرف یہ ہے کہ وہ شریعت کے کسی اصول یا اس کی کسی دلیل کے خلاف نہ ہو بلکہ شریعت کے مزاج اور اس کے تقاضوں کے مطابق ہو[2]۔

---

[1] الشافعی صفحہ ۲۹۸ بحوالہ شرح تحریر جزء ثالث صفحہ ۳۸۱ ۔ [2] الشافعی صفحہ ۲۵۵

مصالح مرسلہ کے قائل امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں[1]۔

صدرِ ریاست کے انتخاب سے متعلق بعض شبہات کا ازالہ شوریٰ کی اس پوری بحث کو پڑھنے کے بعد ممکن ہے اسلام میں صدرِ ریاست کے انتخاب سے متعلق بعض سوالات پیدا ہوں۔ اس وجہ سے ہم آخر میں مختصراً اس کو بھی صاف کر دینا چاہتے ہیں۔

"ہمارے موجودہ اسلامی معاشرے کا آغاز مکے میں کفر کے ماحول میں ہوا تھا اور اس ماحول سے لڑ کر اسلامی معاشرے کی ابتدا کرنے والے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ یہ اسلامی معاشرہ جب اپنے نظم اور سیاسی خود مختاری میں ترقی کر کے ایک اسٹیٹ بننے کی منزل پر پہنچا تو اس کے اولین رئیس بھی آنحضور ہی تھے، اور آپ کسی کے منتخب کردہ نہ تھے بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیے ہوئے تھے۔

دس سال تک آپؐ اس ریاست کی امارت کا فریضہ انجام دینے کے بعد رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے بغیر اس کے کہ اپنی جانشینی کے متعلق کوئی صریح اور قطعی ہدایت دے کر تشریف لے جاتے۔ آپ کے اس سکوت سے، اور قرآن مجید کے اس ارشاد سے کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (مسلمانوں کے معاملات آپس کے مشورے سے انجام پاتے ہیں) صحابۂ کرام نے یہ سمجھا کہ نبی کے بعد رئیسِ مملکت کا تقرر مسلمانوں کے اپنے انتخاب پر چھوڑا گیا ہے، اور یہ انتخاب مسلمانوں کے باہمی مشورے سے ہونا چاہیے۔ چنانچہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب مجمع عام میں ہوا۔

پھر جب ان کا آخری وقت آیا تو اگرچہ ان کی رائے میں خلافت کے لیے موزوں ترین شخص حضرت عمرؓ تھے، لیکن انہوں نے اپنے جانشین کو نامزد نہ کیا بلکہ اکابر صحابہ کو الگ الگ بلا کر ان کی رائے معلوم کی، پھر حضرت عمرؓ کے حق میں اپنی وصیت املا کرائی، پھر حالتِ مرض ہی میں اپنے حجرے کے دروازے سے مسلمانوں کے مجمع عام کو خطاب کر کے فرمایا:۔

اترضون بمن استخلف علیکم؟ فانی — کیا تم راضی ہو اُس شخص سے جس کو مَیں تم پر اپنا جانشین

[1] الشافعی بحوالہ اصول الاسنوی والتحریر لابن ہمام۔

واللہ ما الوت من جھد الرأی ولا ولیت ذا قرابۃ۔ وانی استخلف عمر بن الخطاب، فاسمعوا لہ واطیعوا۔

بتاؤں؟ خدا کی قسم میں نے غور و فکر سے رائے قائم کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے، اور اپنے کسی رشتہ دار کو مقرر نہیں کیا ہے۔ میں نے عمر بن الخطاب کو جانشین بنایا ہے۔ پس تم ان کی سنو اور اطاعت کرو۔

مجمع سے آوازیں آئیں :۔

سمعنا و اطعنا (طبری۔ ج ۲ ص ۶۱۸۔ مطبعۃ الاستقامۃ مصر) "ہم نے سنا اور مانا"

اس طرح مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ کا تقرر بھی نامزدگی سے نہیں ہوا بلکہ خلیفۂ وقت نے مشورے سے ایک شخص کو تجویز کیا اور پھر مجمعِ عام میں اس کو پیش کر کے منظور کرایا۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ کے دنیا سے رخصت ہونے کی باری آئی۔ اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد ترین رفیقوں میں سے چھ اصحاب ایسے موجود تھے جن پر خلافت کے لیے مسلمانوں کی نگاہ پڑ سکتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے انہی چھ اصحاب کی ایک مجلس شوریٰ بنا دی اور ان کے سپرد یہ کام کیا کہ باہمی مشورے سے ایک شخص کو خلیفہ تجویز کریں، اور اعلان کر دیا کہ

من تامر منکم علی غیر مشورۃ من المسلمین فاضربوا عنقہ (الفاروق عمر لمحمد حسین ہیکل ج ۲، ص ۲۱۳)

تم میں سے جو کوئی مسلمانوں کے مشورے کے بغیر زبردستی امیر بنے اس کی گردن مار دو۔

اس مجلس نے بالآخر انتخاب کا کام حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے سپرد کیا اور انہوں نے مدینے میں چل پھر کر عام لوگوں کی رائے معلوم کی گھر گھر جا کر عورتوں تک سے پوچھا۔ مدرسوں میں جا کر طلبہ تک سے دریافت کیا مملکت کے مختلف حصوں کے جو لوگ حج سے اپنے اپنے علاقوں کی طرف واپس جاتے ہوئے مدینے ٹھیرے تھے اُن سے استصواب کیا۔ اور اس تحقیقات سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ امت میں سب سے زیادہ معتمد علیہ دو شخص ہیں، عثمانؓ اور علیؓ۔ اور ان دونوں میں سے عثمانؓ کی طرف زیادہ لوگوں کا میلان ہے۔ اسی رائے پر آخر کار حضرت عثمانؓ کے حق میں فیصلہ ہوا اور مجمع عام میں ان کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔

پھر حضرت عثمانؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اور امت میں سخت افراتفری برپا ہو گئی۔ اس موقع پر چند صحابہ

حضرت علیؓ کے مکان پر جمع ہوئے اور ان سے عرض کیا کہ آج آپ سے زیادہ امارت کا حق دار کوئی نہیں، آپ اس بار کو سنبھالیں۔ حضرت علیؓ نے انکار کیا، مگر وہ اصرار کرتے رہے۔ آخر کار حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر آپ لوگ یہی چاہتے ہیں تو مسجد میں چلیے۔

فان بیعتی لا تکون خفیا ولا تکون الا عن رضا من المسلمین۔ (طبری - ج ۳ - ص ۴۵۰)

کیونکہ میری بیعت خفیہ طور پر نہیں ہو سکتی، اور مسلمانوں کی عام رضامندی کے بغیر اس کا انعقاد ممکن نہیں ہے۔

چنانچہ آپ مسجد نبوی میں تشریف لے گئے اور مہاجرین و انصار جمع ہوئے اور سب کی نہیں تو کم از کم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اکثریت کی مرضی سے آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔

پھر جب حضرت علیؓ پر قاتلانہ حملہ ہوا اور ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد کیا ہم آپ کے صاحبزادے حضرت حسنؓ سے بیعت کریں؟ اس پر انہوں نے جو جواب دیا وہ یہ تھا کہ

ما آمرکم ولا انہاکم، انتم ابصر (طبری - ج ۴ - ص ۱۱۳)

میں نہ تم کو اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں۔ تم لوگ خود اچھی طرح دیکھ سکتے ہو۔

یہ ہے رئیسِ مملکت کے تقرر کے معاملے میں خلافتِ راشدہ کا تعامل اور صحابہ کرام کا اجماعی طرز عمل جس کی بنیاد خلافت کے باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سکوت اور تمام اجتماعی معاملات کے باب میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ پر رکھی گئی تھی۔ اس مستند دستوری رواج سے جو بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں صدر کا انتخاب عام لوگوں کی رضامندی پر منحصر ہے۔ کوئی شخص خود زبردستی امیر بن جانے کا حق نہیں رکھتا۔ کسی خاندان یا طبقے کا اس منصب پر اجارہ نہیں ہے اور انتخاب کسی جبر کے بغیر مسلمانوں کی آزادانہ رضامندی سے ہونا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ مسلمانوں کی پسند کیسے معلوم کی جائے، تو اس کے لیے اسلام میں کوئی خاص طریق کار مقرر نہیں کر دیا گیا ہے۔ حالات اور ضروریات کے لحاظ سے مختلف طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ ان سے معقول طور پر یہ معلوم کیا جا سکتا ہو کہ جمہور قوم کا اعتماد کس شخص کو حاصل ہے۔"[1]

---

[1] صدر ریاست کے انتخاب سے متعلق یہ تمام عبارت "اسلامی دستور کی تدوین" (از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی) سے نقل کی گئی ہے۔